محمد عابد مسعود ڈوگر

ہوس کے قیدی' لاشوں کے سوداگر

جناب عابد مسعود نے زیرنظر تحریر میں بہت سے تلخ حقائق کی نقاب کشائی کی ہے۔ اسے پڑھ کر ہماری طرح قارئین کو بھی حیرت ہوگی۔ عابد مسعود درونِ خانہ کے آدمی ہیں اور وہ اپنی پیش کردہ معلومات کے خود ذمہ دار ہیں۔ ہم اس تحریر کو نقطۂ نظر کے طور پر شائع کر رہے ہیں۔ ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں۔ اگر کوئی صاحب اس عنوان پر اظہار خیال کرنا چاہیں تو ہمارے صفحات حاضر ہیں۔ (مدیر)

یکم جنوری ۲۰۰۳ء کو روزنامہ ''اسلام'' کے رنگین ایڈیشن میں جناب ابن الحسن عباسی کا ایک اہم مضمون ''پاکستان کا قیدی'' شائع ہوا۔ روزنامہ ''اسلام'' نے اگرچہ چند روز بعد اس مضمون کی اشاعت پر باقاعدہ اور قدرے طویل معذرت کر لی۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں' اس مضمون کی اشاعت اور اس کے بعد ہونے والی معذرت دونوں ایک ہی وقت میں طے کئے جانے والے دو علیحدہ علیحدہ کام تھے۔ ہمارے دینی اداروں میں بزرگانِ دین کی ایسی علمی کمزوریوں یا غلطیوں کو بڑی آسانی سے ''تسامح'' کا نام دے کر دبا دیا جاتا ہے اور یہ لفظ اتنے زوردار طریقے سے طالب علموں کے سامنے دہرایا جاتا ہے کہ سننے والوں کا دھیان غلطی سے زیادہ اس لفظ کی طرف ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں روزنامہ ''اسلام کے اصحاب ''حل وعقد'' کی اس حرکت پر جگر مرادآبادی کا شعر یاد آ گیا ہے

پیتا بغیر اذن کے کب تھی یہ مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

پاکستان میں قائم ہو کر اردگرد کے ممالک میں جہاد کرنے والی مختلف عسکری تنظیموں کی ساخت، شان نزول اور طریقۂ کار بلکہ طریقۂ واردات کے بارے میں کافی عرصہ سے کئی باتیں ہمارے قلم کی نوک پر آ کے رہ جاتی ہیں۔ دل میں بار بار یہ خیال اٹھتا تھا کہ رکھ رکھاؤ بھی تو کسی چیز کا نام ہے۔ ہر دفعہ اس فقرے کی لوری دے کر ہم اپنی اس ننھی سی ذمہ داری کو سلا دیا کرتے تھے۔ اب جبکہ ''بڑی اماں'' نے خود ہی گھر کی ساری باتیں بیچ چوراہے کے اونچی اونچی آواز میں سب کو بتانا شروع کر دی ہیں تو ہم سے رہا نہیں گیا۔ اگرچہ یہ ''بڑی بی'' بعد میں فرداً فرداً سب کو یہ بتانا شروع کر دے کہ بڑھاپے کی وجہ سے اعصاب کمزور ہو چکے ہیں۔ اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رہتا۔ غصے میں آ کر جانے اس دن میں کیا کیا غلط سلط بک گئی

'میرے بچے تو ایسے نہیں۔ وہ تو بہت ''پیسے'' ہیں۔ کیا کریں دینی حلقوں سے وابستہ اور ''انہے واہ'' وابستہ لوگ تو اس کو تسامح کہہ کے نظر انداز کر دیں گے مگر آج کچھ درد میرے سینے میں سوا ہوتا ہے.....

۱۹۷۹ء میں سوویت یونین نے اپنے سرخ پنجے افغانستان میں گاڑے اور انتہائی خوفناک انداز میں گرم پانیوں سے اپنی پیاس بجھانے کے لیے پاکستان کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ پاکستان میں ضیاء الحق مارشل لاء کو آئے ہوئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے کہ اس نے سرخ ریچھ کے بڑھتے ہوئے پنجوں کو افغانستان میں ہی توڑنے اور اس کی کلائی مروڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے کہ آئی ایس آئی افغانستان میں اپنا باضابطہ مشن شروع کرتی 'پاکستان سے چند درویشوں نے اپنے اوپر عائد ہونے والی اسلامی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ افغانستان میں وہاں کے مقامی علماء اپنی بساط کے مطابق جہاد کا اعلان کر چکے تھے۔ یہ درویش Divinder Line کو روندتے ہوئے افغانستان جا پہنچے۔ میری مراد عجم کے ڈاکٹر عبداللہ عزامؒ، مولانا ارشاد احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء ہیں۔ ان سب لوگوں میں جہاد کی روح پھونکنے اور ان کو اس مشن کے لیے تیار کرنے والے جامعہ خیر المدارس ملتان کے شیخ الحدیث مولانا محمد شریف کاشمیری قدس سرہ کے فرزند ارجمند مولوی محمد مسعود علوی کشمیری شہیدؒ تھے۔ مولانا ارشاد احمدؒ مولانا مسعود علوی کے شاگرد تھے۔ خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف میں مولانا محمد مسعود کشمیری شہید سے زانوئے تلمذ طے کیا۔ بعد میں اپنے استاد کی جہادی فکر پر اپنی زندگی وقف کر دی اور تادمِ شہادت پوری استقامت کے ساتھ اس پر کاربند رہے۔ یہ وہ پہلی جماعت ہے جو برصغیر میں بالاکوٹ اور شاملی کے معرکوں کے بعد بحیثیت جماعت اپنے اوپر عائد ہونے والی عظیم ذمے داری سے سبکدوش ہونے کے لیے سب سے پہلے میدانِ عمل میں پہنچی۔ افغانستان جانے سے پہلے وہاں روسی فوجوں کے خلاف ہونے والی دھیمی دھیمی جدوجہد جو کہ آہستہ آہستہ مسلسل بڑھتی چلی جا رہی تھی' کے بارے میں پاکستان کے جید علماء سے باقاعدہ طور پر فتاویٰ طلب کیے۔ مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہٗ کے باضابطہ اور علانیہ فتویٰ کے بعد یہ حضرات افغانستان میں ہونے والے جہاد میں شریک ہوئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہندوستان کی تحریک آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ جہادِ آزادی کی بنیاد ہے۔ اسی طرح افغانستان میں روسی کمیونسٹ فوجوں کے خلاف ہونے والی جدوجہد کی بنیاد مولانا مفتی محمودؒ کا فتویٰ ہے۔ آہستہ آہستہ ان حضرات کے بار بار افغانستان آنے جانے اور دینی مدارس میں اپنے احباب سے ہونے والے رابطوں کے بعد پاکستان کے مدارس کی بڑی تعداد باقاعدہ طور پر افغان جہاد میں شامل ہوتی چلی گئی۔ یہ سارے لوگ امت کے بہترین لوگ تھے جنہوں نے بغیر کسی ہوس کے اپنی دینی ذمہ داری کو پورا کیا۔ بہت سے منزل پا گئے۔ کئی ایک معذور ہوئے۔ بہت سوں کے حصے میں غازی کی سعادت آئی۔ یہ سارے لوگ اپنے مقصد کی لگن میں بالکل سادہ اور مخلص تھے۔ اسی کی دہائی کے اوائل میں جب یہ جدوجہد خاصی بڑھ چکی تو پاکستان کی

خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی باضابطہ طور پر اس میں شریک ہوئی۔ افواج پاکستان کی افغان جہاد میں شمولیت، جس بھی نوعیت کی ہو، وہ پاکستان کے مفاد کے لیے تو ہو سکتی ہے لیکن ہم اسے اسلامی کہنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ ''مہربانوں'' کے رنگ میں آ جانے کے بعد یہ انتہائی صاف شفاف پانی سے بھرا تالاب چار پانچ دیہاتوں کے مشترکہ استعمال میں رہنے والا ایک گدلا جوہڑ بن گیا۔ جہادی رہنماؤں نے امداد کے نام پر بڑی بڑی رقمیں اور سہولیات ''مہربانوں'' کے ہی طفیل دیکھیں۔ غالباً اسی کی دہائی کے پہلے نصف کے آخر میں سی آئی اے نے اپنا مشن براستہ پاکستان افغانستان لانچ کرنا شروع کیا۔ تب تو بڑے کمانڈروں کے وارے نیارے ہو گئے۔ مخلص جہادی لوگ گرم چادر کی بکل مارے اپنے کام میں مصروف رہے اور ہوس کے قیدی، لاشوں کے سوداگر پشاور، اسلام آباد، کوئٹہ، میران شاہ میں پرتعیش اور ٹھاٹھ باٹھ والی زندگی کے مزے لوٹتے رہے۔ لمبی لمبی گاڑیاں، فارن کرنسی اکاؤنٹ، ہر بڑے شہر میں رہائش کے لیے بنگلہ اور خدمت کے لیے نوکر چاکر ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ مہربانوں نے باہر سے آنے والی دھڑا دھڑ فوجی امداد کو افغانستان پہنچانے اور ٹھکانے لگانے دونوں کے بندوبست کیے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ''فلٹر'' لگے ہوئے تھے، جن کو اپنی پسند کے مطابق ایڈجسٹ کیا جاتا تھا۔ مجاہدین کے ہاتھوں میں لہرانے والی گاڑیوں کی چابیاں اور انگلیوں کے پوروں پر نہ ختم ہونے والے نوٹوں کی گنتی تو وہ نعمت تھی جو ان ''فلٹروں'' سے پاس ہو کر ان تک پہنچتی تھی۔ جو کچھ بچ جاتا یا بچا لیا جاتا بلکہ روک لیا جاتا، وہ اس کے علاوہ ہے۔ اُس کی گنتی عقل کو چکرا دینے والا کام ہے۔ مجھ جیسے عام آدمی نہیں بلکہ بڑے بڑے حسابیوں، کتابیوں کی عقل اس قطار و شمار کو دیکھ کر جواب دے جائے گی۔ افغان جہاد کے بعد ''تاجروں'' نے نئی منڈیاں تلاش کر لیں۔ جہاد کشمیر کا نام کانوں میں پڑنے لگا' یہ وہ وقت تھا کہ جب روس افغانستان سے جا چکا، مجاہدین باہم دست و گریباں، افغانستان کو امریکی امداد کی سپلائی بند اور مہربان ''کوڑیاں'' پھینکنے میں خاصی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ بلکہ یوں کہیے کوڑیاں اُن کے ہاتھوں کی اسیر ہو چکی تھیں۔ جب چاہتے' جہاں چاہتے بازی کو اپنی طرف پلٹا دیتے۔ مظفر آباد میں وہی رونقیں دیکھی جانے لگیں جو کبھی کوئٹہ، پشاور، میران شاہ کا مقدر تھیں۔ بہت سے نئے تاجر مارکیٹ کا چڑھاؤ دیکھ کر اچانک میدان میں سامنے آئے۔ اِن میں سے کئی ایسے تھے جنہوں نے جہادِ افغانستان کی گرد کو بھی نہیں چھوا تھا مگر پھر بھی اپنی تاریخ کے نوشتے میں کئی کئی شہداء کا مقدس نام لیے پھرتے تھے۔ پورے پاکستان میں جہادی کمانڈروں کی ائیر کنڈیشنڈ گاڑیاں برابر نظر آنے لگیں۔ تاجروں نے دلالوں کے ساتھ باقاعدہ منتھلیاں طے کر لیں۔ ۱۹۹۴ء میں دو مجاہد تنظیموں کے باہمی اشتراک سے قائم ہونے والی ''حرکت الانصار'' کے صرف ایک دھڑے کو ۳۵ لاکھ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ بے تحاشا پیسے نے ضمیر کا گلا گھونٹ دیا۔ لاشوں کی سیاست کرنے والے ان تجار نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی نہ کی کہ جن نوجوانوں کو ہم بلا مقصد اس آگ میں صرف اور صرف پیسے اور نام کے لیے جھونکتے چلے جا رہے ہیں۔ اُن کی بابت

کسی روز ہم سے سوال ہونا ہے اور سوال کرنے والا جواب پائے بغیر بھاگنے نہ دے گا۔ کیونکہ اس دن عدالت صرف اُسی کی ہوگی۔ کئی نوجوان ایسے ''تاریخی معرکوں'' میں شہید ہوئے، جن کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ اہل حدیث مکتبہ فکر کے مشہور خطیب مولانا عبدالحفیظ فیصل آبادی کی ''داستانِ الم'' کوئی سنے تو جانے کہ تاریک راہوں میں بے مقصد مارے جانے والے جوان بیٹے کی موت کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ پاکستان کے جید علماء نے اس غیر منظم اور بغیر کسی ایک شرعی امیر کی موجودگی کے جتھے بازی کو کیسے شرعی قرار دے دیا۔ طالبان کے آنے تک افغان جہاد کے ثمرات اس لیے ضائع ہوتے رہے کہ گیارہ سالہ طویل جہاد بغیر کسی ایک شرعی امیر کے ہوتا رہا۔ نتیجۃً اس معرکہ کے اختتام پر نبرد آزما قوتیں اقتدار کے حصول اور غنیمت کی تقسیم پر آپس میں الجھ پڑیں۔ پوری دنیا نے اس الجھن کا ڈرامہ دیکھا۔ خصوصاً مغرب میں بسنے والے مسلمانوں کو کئی تند و تیز طعنوں کا سامنا کرنا پڑا اور سب سے بڑھ کر کئی قیمتی جانیں بے مقصد ضائع ہوگئیں۔ یہی کچھ کشمیر میں ہو رہا ہے۔ جب تک ساری جہادی قوتیں جو کہ بزعم خویش جہاد کا فریضہ ادا کر رہی ہیں' ایک امیر پر متفق نہیں ہو جاتیں' کشمیر میں ہونے والی اس غیر منظم جدوجہد کو کس طرح جہاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ مجاہدین کی باہمی خصومت اتنی زیادہ ہے کہ کئی دفعہ وہ بھارتی فوجیوں سے زیادہ اپنے معاصرین کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ ہم اربابِ اقتدار اور اصحابِ علم سے مشترکہ طور پر یہ گزارش کریں گے کہ وہ اس دھندے کو بند کروانے کے لیے اپنا اپنا جائز اور قانونی کردار ادا کریں۔ معاملے کی سنگینی کا یہ عالم ہے کہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ دھندہ ''اُس بازار'' میں ہونے والے دھندے سے کہیں زیادہ قبیح اور شرمناک ہے۔ مولانا مسعود اظہر اور ان کی جماعت مستقل طور پر ایک کالم کی چیز ہے۔ یہ حضرت آج کل پاکستانی سیاست میں جوہر دکھلانے کے لیے بڑے بے تاب ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ ''پاکستان کے امیر المومنین'' کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔ ماسوائے اس کے کہ اسلامی تعلیمات میں تو لاشوں کی سیاست کے قبیح دھندے کی گنجائش نہیں۔ آپ جمہوری تماشے کا حصہ بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ آپ کی آمد، اٹھان اور بیٹھک تا حال محل نظر ہے۔ اب تو خلافتوں کی اجازت دینے والے بھی شرمندہ ہوں گے۔ آپ کے لیے بہتر تھا کہ گولیوں، ٹافیوں کی دکان کھول لیتے۔ کم از کم اس جرم سے تو بچ جاتے۔ اس معاملے میں سب سے بڑی مجرم خود ''بڑی اماں'' ہیں' جنہوں نے اپنے اس راج دلارے کو اسلامیان پاکستان کے نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا۔ ذرا اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کریں اور اپنے پرچوں میں ان سے برأت اور لاتعلقی اور سب سے بڑھ کر اس سلسلے میں ہونے والی تاریخی غفلت پر قوم سے معافی مانگیں۔ کیونکہ اہل تقویٰ کے لیے غلطی کے پتہ چل جانے کے بعد معذرت ہرگز بری چیز نہیں۔ اگر کوئی صاحب میری ان گزارشات کے جواب میں کچھ کہنا چاہیں تو مجھے خوشی ہوگی' بشرطیکہ دلیل سے بات کی جائے اور ٹھنڈے دل سے سنی بھی جائے۔